Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

Manto's Film World: A Critical Review of before the Establishment of Pakistan

منٹو کی فلمی دنیا: قیام پاکستان سے پہلے کا تنقیدی جائزہ

Nida Zahid
Ph.D Urdu Scholar, The Women University Multan
Sajida Aslam
Ph.D Urdu Scholar, The Women University Multan

Citation: Nida Zahid, Sajida Aslam (2025). Manto's Film World: A Critical Review of before the Establishment of Pakistan, Al-Qirtas, 4(1). Retrieved from https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas/article/view/374

Abstract:

Saadat Hasan Manto is mainly known for his fiction but he also wrote drama, essays, letters and sketches. Translated from world literature and edited magazines. But one of Manto's key references is his commitment to filmography. Where he spent the most important years of his life. Manto spent most of his life in film industry mixing with directors, musicians, filmmakers, actors and writers. And became the residents of this town. Here his life was tumultuous and he was a part of many conflicts and riots. Minto wrote scripts for several films, some of which were filmed and became popular. However, most of the films either flopped or were not shot at all, much to Minto's dismay. But this does not diminish the importance of Manto's early filmmaking, rather it is clear that the themes he penned in his filmmaking were social reforms.

Keywords: Saadat Hasan Manto; Manto's Film; Film Kisan kanya; Film Tu Bara kay Mein Bara; Film Mirza Ghalib.

سعادت حسن منٹو افسانہ نگاری کے طور پر معروف ہوئے انہوں نے اردو افسانہ میں سماجی حقیقت نگاری کو متعارف کروایا۔ خاص طور پر برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر انہوں نے بے رحم حقیقت کو عمدگی سے موضوع بنایا اور بہت سے لازوال افسانے لکھے۔ افسانہ کے ساتھ ساتھ سعادت حسن منٹو نے ادب کی دیگر اصناف کو بھی موضوع بنایا انہوں نے ڈرامہ، مضامین، خطوط، خاکے اور فلمی کہانیاں بھی لکھیں وہ کئی رسائل کے مدیر رہے۔ انہوں نے عالمی ادب سے تراجم کئے جو ان کی وسعت نظر اور فن پر مہارت کا ثبوت ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے کئی افسانوں پر فحش نگاری کا الزام لگایا گیا اور ان کے سفر میں رجعت پسندوں نے بہت سی مشکلات پیدا کیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ سعادت حسن منٹو اردو فکشن نگاری کا بڑا نام ہے جس کی تحریریں سماج اور اس کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

منٹو کا بچپن امر تسر اور لاہور میں گزرا لیکن فلم کا شوق انہیں بمبئی لے گیا۔ جہاں وہ باقاعدہ طور پر فلم سے وابستہ ہوئے لیکن ان کے اندر سے امر تسر کبھی نہیں گیا۔ اس شہر نے ان کے شعور کی پرورش کی، ابتدائی فلم بینی کا شوق دوستوں کی محفلوں سے ہوا۔ اسی شہر میں اس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ خاص طور پر جلیاں والا باغ میں ہونے والے واقعے نے ان کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے، جس کی جھلک ان کے افسانوں اور دیگر تحریروں میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ نوجوانی میں منٹو کو شاعری سے بھی دلچسپی رہی لیکن افسانہ اور فلم ان کے میدان ثابت ہوئے فلم کی طرف ایک گہری رغبت انہیں بچپن سے ہی رہی۔ بقول منٹو:

> ''فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی خواہش کالج کے ہر طالب علم کے دل میں ہوتی ہے یہی جنون میرے سر پر بھی سوار تھا۔ چنانچہ میں نے اس جنون کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت سے جتن کئے۔[i]''

فلم بینی کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے منٹو نے اس عہد کے معروف بالی ووڈ اداکاروں کے بارے میں جاننا شروع کیا وہ اخبارات اور رسائل میں ان کے بارے میں پڑھتے اور فلم دیکھنے کے بعد اپنی رائے دوستوں کے ساتھ بانٹتے تھے۔ منٹو کو کئی اداکارائیں بہت پسند تھیں۔ وہ فلموں میں کہانی کے ساتھ ساتھ سیٹ، لباس مناظر کیمرہ کا استعمال اداکاری پر گہری نظر رکھتے تھے جس نے ان کو فلم کا ایک غیر معمولی نقاد بنا دیا تھا۔ منٹو نے اپنی تحریر اور گفتگو میں فلموں کی تکنیک کہانی، اسکرپٹ، منظر نگاری، مکالمہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ منٹو کی مختلف فوٹو گرافرز سے گہری دوستی رہی جس وجہ سے انہیں تصویر اور فلم کی پکچرائزیشن کی مزید سوجھ بوجھ آئی۔ منٹو اپنے ان دوستوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی اور بالی ووڈ سینما پر گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ منٹو کو جو فنکار پسند تھے ان میں گریٹا کاربو، ہیلن گش، روزینا پوڈسٹا، بیلاڈور تھی، گلوریا سوانس اور مارلین ڈٹرچ کے نام نمایاں ہیں۔ یوں بچپن سے ہی منٹو کا دل فلموں کی طرف راغب ہوا، وہ بات بات میں فلموں سے مثالیں دیتے اور معروف گیت گنگناتے رہتے تھے۔ منٹو کے تخیل اور فلمی دنیا کے تجربات کے حوالے سے پرویز انجم لکھتے ہیں کہ:

> ''ذہن کی استعداد اور نوعیت دونوں خداداد ہوتی ہیں اور تجربات اسے ماحول عطا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں دونوں چیزوں کا کسی فنکار میں اکٹھے ہونا محض اتفاق ہوتا ہے اس سطح کے فنکار پر فلموں کا اثر دیرپا بھی ہوتا ہے اور دور اثر بھی لہذا لان چینی، گریٹا گاربو، میری یکفورڈ، لیلن گش اور بورس کارلوف جیسے نامور اداکاروں اور ایرک وان سٹراہیم، فرینک کبرا، ڈبلیو۔ ڈی گرفتھ جیسے جینئس ہدایت کاروں کی بلند معیار اور تخلیقی طور پر نئے جہانوں پر مشتمل فلمی تخلیقات نے بھی منٹو جیسے تخلیقی فنکار کے مشاہدے کی آنکھ کو تخلیقی شعور بخشا۔''[ii]

منٹو فلم کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ وہ ہالی ووڈ کے اداکاروں کے جیسا لباس پہنتے ان کی پسندیدہ خوشبو لگاتے اور ان کے انداز میں جملے ادا کرتے۔ منٹو نے اس عہد میں افسانے کو ایک طرف رکھا اور فلموں کے حوالے سے بہت سے مضامین لکھے۔ کالج کے زمانے سے ہی منٹو کے ذہن میں فلمی دنیا میں قدم

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

رکھنے کی خواہش پروان چڑھتی رہی۔ بھگت سنگھ کی پھانسی کا بہت اثر ہوا وہ ان کی زندگی پر فلم بنانا چاہتے تھے۔ بیسویں صدی کا نصف اول ہندوستان میں شدید انتشار کا عہد تھا۔ دو عالمی جنگوں نے دنیا کو ایک المناک تنہائی میں دھکیل دیا تھا۔ ایسے میں ہندوستان کے لوگوں کے لیے سینما ایک تفریح کا باعث تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں سائنسی ایجادات کی بدولت زندگی کے مختلف شعبوں میں انسان کو سہولت میسر آئی، اس کے سوچنے سمجھنے اور چیزوں کو دیکھنے کا انداز تبدیل ہوا، سینما بھی انسانی تاریخ کی ایک ایسی ہی بڑی تبدیلی ثابت ہوا۔ سینما کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر امجد ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ:

> "1890ء کی دہائی کے آخر میں لوئی لمائر کے ڈیزائن کردہ سینماٹو گراف کی ایجاد ایک بے مثال کامیابی تھی معمولی ردوبدل سے اسے پروجیکٹر میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے دنیا بھر کے ممالک میں اپنے نمائندے بھیجنا شروع کر دیے تھے۔ تاکہ وہ اس جادوئی ڈبے کے کمالات سے لوگوں کو آگاہ کر سکیں۔"[iii]

سینماٹو گراف کو چھے ماہ کے عرصے میں انگلستان، بیلجیم، ہالینڈ، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، سپین، اٹلی، سربیا، روس، سویڈن، سوئزرلینڈ کے ساتھ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں متعارف ہو چکا تھا۔ اگلے چند ہی برسوں میں یہ الجزائر تیونس، مصر، ترکی، آسٹریلیا، چائنا، جاپان، میکسیکو اور ہندوستان تک بھی پہنچ گیا۔[iv] ہندوستان میں بمبئی وہ پہلا شہر تھا جہاں سے سینما کا آغاز ہوا اور پھر مدراس، کلکتہ اور لاہور اس کے مرکز بن گئے۔ جلد ہی صنعت کار اور سرمایہ دار اس طرف متوجہ ہوئے ہندوستان کے فنکاروں کو ایک نیا وسیلہ میسر آیا جس کے ذریعے انہوں نے اپنے فن کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں موسیقی عروج پر تھی۔ ملک کے مرکزی شہروں میں بازار حسن تھے، جہاں ناچ دیکھنے اور گانا سننے ملک بھر سے لوگ آتے تھے۔ برصغیر میں فلم کا آغاز ہوا تو اس میں موسیقی کا ایک الگ حصہ شامل کیا جانے لگا اور دیگر مقامی فنون بھی اس میں شامل ہو گئے۔ یوں ملک بھر کے کہانی کار، شاعر، موسیقار بمبئی میں جمع ہو گئے اور مل کر اس فن کو آگے بڑھانے لگے۔

سینما کے اس ابتدائی دور نے منٹو کے آنے والے وقت کے لئے راہ ہموار کی۔ منٹو کی ابتدائی زندگی غربت اور تنگدستی میں گزری لیکن اس کی آنکھوں میں بڑے خواب تھے۔ منٹو اپنے آس پاس کے لوگوں میں ایک فنکار کے طور پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے ذوق کو نکھارنے اور پروان چڑھانے میں باری علیگ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی تحریک پر منٹو نے عالمی ادب سے تراجم کئے، فلموں پر تبصرے کئے اور اپنے شوق کو آگے بڑھایا۔ باری علیگ کے علاوہ اختر شیرانی نے بھی ان کا ساتھ دیا منٹو نے روزنامہ مساوات اور پارس جیسے اخبارات میں بہت کم اجرت پر کام کیا۔ اب منٹو اپنی اس منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔ اسی لیے وہ لاہور کی صحافتی زندگی سے بیزار ہو کر بمبئی چلے آئے اور نذیر لدھیانوی کے رسالے مصور کے لیے کام کرنے لگے اور یہیں سے ان کے فلمی سفر کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر طاہر عباس کہتے ہیں کہ

> "ان کا فلم انڈسٹری میں آغاز منشی منٹو کی حیثیت سے ہوا اور جلد ہی ان کا نام فلم نگری میں گونجنے لگا۔ منٹو کی زندگی کے یہ خوشگوار ترین دن کہے جا سکتے ہیں۔"[v]

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

منٹو نے خود فلمیں لکھیں اور شاعری کے لیے احمد ندیم قاسمی سے بہت سے گیت لکھوائے۔ انہوں نے آغا خلش کاشمیری کو بھی بمبئی بلوالیا جو بہت اچھے شاعر تھے اور منٹو کے دوست تھے۔ یوں منٹو کے بہت سے دوست ان کے گرد جمع ہو گئے اور انہیں بھرپور طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ منٹو کئی فلم اسٹوڈیوز سے وابستہ رہے اور ان کے لیے کہانیاں لکھیں۔ منٹو نے فلم انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کے بہت منفرد خاکے لکھے۔ ان کے بہت سے افسانے بھی ایسے ہیں جن کے کردار یا ماحول فلم نگری سے لیے گئے ہیں۔ منٹو "امپیریل فلم کمپنی" کے تنخواہ دار ملازم تھے لیکن بہت سی کہانیاں انہوں نے دوسری کمپنیوں کو اپنا نام لیے بغیر فروخت کیں۔ بمبئی فلم انڈسٹری میں ان کی پہلی فلم "کسان کنیا" تھی۔ منٹو نے اس فلم کا اسکرپٹ بہت محنت سے لکھا جو ایک غریب اور ایماندار کسان کے گرد گھومتا ہے اور ایک جاگیر دار اس پر مظالم ڈھاتا ہے۔ اس کسان کو اجرت کے نام پر صرف روٹی ملتی تھی۔ اس فلم میں ہندوستان کے دیہات کی زندگی اور اس سے جڑی جزئیات کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس فلم کے ذریعے منٹو نے ہندوستان کے ایک پسماندہ طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ منٹو نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی زندگی، تقدس اور حیثیت کو بھی نمایاں کیا ہے۔ "کسان کنیا" ہندوستان میں مکمل طور پر رنگین بنائی جانے والی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کو 1937ء میں ریلیز کیا گیا۔ اور اس نے بہت اچھا بزنس کیا۔ جس سے منٹو کو فلم نگری میں قدم جمانے میں مدد ملی۔ اس فلم میں ہندوستان کے نمایاں اداکاروں نے کام کیا جو زیادہ تر تھیٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ منٹو نے اس وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس سامراجی عہد میں ہندوستان کے لوگوں کو بیدار کیا۔ "کسان کنیا" کے حوالے سے پرویز انجم لکھتے ہیں کہ :

"کسان کنیا ہندوستان میں مکمل طور پر بنائی جانے والی پہلی رنگین فلم تھی اس میں سائن مکرا استعمال ہوا تھا جو کمپنی نے امپورٹ کیا تھا منٹو اب انڈسٹری سے آشنا ہوتے جا رہے تھے۔" [vi]

منٹو جلد ہی امپیریل فلم انڈسٹری سے الگ ہو گئے لیکن ان کی دوسری فلم "مجھے پاپی کہو" اس کمپنی کے تحت 1938ء میں ریلیز ہوئی۔ لیکن یہ فلم باکس آفس پر بری طرح ناکام ہو گئی جس کا منٹو کو بہت دکھ ہوا۔ اس ریلیز کے ساتھ منٹو نے مشکل وقت دیکھا۔ اسی عرصے میں منٹو کی شادی ہوئی۔ امپیریل فلم کمپنی سے علیحدگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کمپنی کے لوگوں نے منٹو کی لکھی ہوئی فلم میں اپنی مرضی سے ردوبدل کر دی اور فلم کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس کا منٹو کو بہت افسوس اور غصہ تھا۔ "مجھے پاپی کہو" کی ہدایت کاری حافظ جی نے دی تھی اور رتن بائی اس فلم کی ہیروئن تھی جو اس وقت کی ایک معروف اداکارہ تھی منٹو 'سروج موویٹون' سے وابستہ ہو گئے جو رومانوی فلموں کے لیے معروف تھی۔ منٹو فلم کے ذریعے معاشرے میں بدلاؤ لانا چاہتے تھے۔ ایک ناکام فلم کے بعد منٹو کو بمبئی میں سنبھلنے میں بہت وقت لگا۔ منٹو نے تیسری فلم "سروج موویٹون" کے تحت "تو بڑا کہ میں بڑا" لکھی۔ یہ فلم بھی 1938ء میں ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر ناکام ہو گئی۔ اس فلم کی ناکامی کے بعد یہ کمپنی دیوالیہ ہو گئی اور منٹو کے برے دن شروع ہو گئے۔ اس کمپنی نے نام بدل کر "ہندوستان منی ٹون" نام رکھ لیا۔

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

اس فلم کی ناکامی کے پیچھے ایک بڑی وجہ وہ سوچ تھی جو منٹو نے اس فلم کے ذریعے دکھانا چاہی تھی۔ منٹو معاشرے کی عکاسی کر رہے تھے مگر ہندوستان سینما کے لوگ اس کے عادی نہیں تھے۔ منٹو نے اس فلم میں امیر اور غریب کے تضاد کو دکھانا چاہا کہ اصل میں بڑا وہ ہے جو کردار میں بڑا ہے۔ منٹو نے اس فلم کے انجام کو کھلا رکھا اور وہ خاصا پیچیدہ بھی ہو گیا، فلم کے دیکھنے والے اس کا فیصلہ نہیں کر پائے۔ اس فلم کے لیے ایک پڑھا لکھا فیصلہ ساز فلم بین چاہیے تھا جو میسر نہ آ سکا۔ منٹو کی اکثر فلموں میں روسی انقلاب اور مارکسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ یہی تناظر فلم " تو بڑا کہ میں بڑا" میں بھی موجود تھا جس کو سمجھا نہیں گیا۔ دو ناکام فلموں کے بعد منٹو نے "مڈ عرف اپنی نگریا" کے عنوان سے فلم لکھی۔ اس فلم کے مکالمے اور منظر نامے بھی منٹو نے خود لکھے، یہ فلم کامیاب ٹھہری۔ جس کی وجہ سے منٹو کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا۔ اس فلم میں ہندوستان کے نچلے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس میں کیچڑ کو ایک استعارے کے طور پر لیا گیا ہے۔ فلم کا ہیرو کیچڑ کو پسند کرتا ہے اور نچلے طبقے سے دوسری طرف ایک امیر خاندان کی لڑکی ہے دونوں کو محبت ہو جاتی ہے لیکن زمانے کے رسوم اور تضادات ان کو ایک نہیں ہونے دیتے۔ اس فلم کی کہانی کے حوالے سے منٹو نے احمد ندیم قاسمی سے بھی مشاورت کی اور کہانی کا انجام طے کیا۔ وہ احمد ندیم قاسمی کو خط میں لکھتے ہیں کہ: "میں یہاں تک لکھ سکا ہوں اس کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں میں چاہتا ہوں کہ ناامید ہو کر پرتھوی روپے کو پھینک دینا چاہے۔۔۔ آخری سین وہی جو آغاز میں ہے یعنی پرتھوی اور سوشیلا ایک چھکڑے میں جا رہے ہوں اور ان کے بچے پیدا ہوں۔۔۔ آپ فوراً ہی اس کے بارے میں غور فرما کر مجھے لکھیں میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔"[vii] اس میں منٹو کے افسانے نیا قانون کا کردار منگو کوچوان بھی نظر آتا ہے۔ یہ فلم دیہات کے پسماندہ ماحول میں فلمائی گئی۔ یہ فلم بینوں کو پسند آئی، گلی گلی اس کے پوسٹر نظر آئے۔ اس فلم میں منٹو نے دلچسپ کہانی کے ذریعے اپنے نظریات کو بھی دکھایا۔

منٹو کی اگلی فلم "پڑوسن" 1940ء میں شائع ہوئی۔ اس فلم میں منٹو نے ہندو مسلم اتحاد کو دکھایا ہے۔ اس زمانے میں منٹو پر اصلاح معاشرہ کی دھن سوار تھی۔ فلم میں دونوں مذاہب کے بہت سے تضادات دکھائے گئے لیکن ایک معاشرے میں ان کے ساتھ جینے اور ایک دوسرے کے لیے رواداری دکھانے کا درس ملتا ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین اس فلم کا مرکزی موضوع ہے۔ منٹو نے ایک طوائف کے مکان کو مرکز میں رکھ کر ان دونوں مذاہب کے لوگوں کو ملنے کا ایک مشترکہ مقام فراہم کیا ہے۔ اس فلم کی کہانی میں منٹو کا تخلیقی ذہن، سوچ، تدبر اور مشاہدہ نظر آتا ہے۔

اگست 1940ء میں منٹو نے فلم " اسٹیل" لکھی۔ یہ فلم منٹو نے فلمی ادارے "انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ" کے لیے لکھی تھی۔ اس فلم کے پروڈیوسر داس ڈاگا تھے۔ منٹو کو اس فلم کا معاوضہ چھ سو روپے ملا جو اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی۔ منٹو کوئی فلم لکھتے تو اس فلم کے دیگر شعبوں کی بابت کوشش کرتے کہ ان کے دوستوں کو بھی کام ملے۔ اس فلم کی بارے میں انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو خط میں لکھا:

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

"میں نے "اسٹیل" کو مکمل کر لیا ہے چنانچہ آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اس کے فلمانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کا حق الخدمت مجھے چھ سو روپے ملے گا۔ اسٹیل کے گیت آپ لکھیں گے میں بہت جلد اس کے افسانے کی ایک نقل آپ کو ارسال کر دوں گا تاکہ آپ اس کا بغور مطالعہ کر لیں۔"[viii]

منٹو کی شدید خواہش تھی کہ اس فلم کو جلد از جلد فلمایا جائے منٹو اس فلم کے گیتوں کے لیے احمد ندیم قاسمی کو قائل کر رہے تھے۔ اگر ایک گیت آیا تو اس میں اگر تھوڑا سا بھی مسئلہ ہوا یعنی کہ وہ اگر فلم کے سین سے تال میل نہیں کھا رہا تو اسے دوبارہ لکھنے کو کہہ دیا۔ لیکن اس فلم نے طول پکڑ لیا۔ ایک بڑی وجہ یہ کہ کمپنی ایک محدود اور پرائیویٹ کمپنی تھی اس کے کئی مالکان تھے سب کا کسی ایک بات پر راضی ہونا بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف ان کا اسٹوڈیو بن رہا تھا جس پر کثیر رقم خرچ ہو رہی تھی۔ لہذا یہ فلم نہ بنائی جا سکی۔ تاہم اس کے گیت جو کہ موسیقار رفیق غزنوی نے گائے تھے ریڈیو پر بھی نشر ہوئے۔ یوں فلم "اسٹیل" ایک ادھوری فلم میں تبدیل ہو گئی۔

جنوری 1940ء میں ہی منٹو کو ایک اور فلم "دھرم پتنی" لکھنے کا کام مل گیا۔ منٹو ہر کام کی بابت احمد ندیم قاسمی سے مشاورت ضرور کرتے تھے۔ چونکہ اس فلم کا سکرپٹ اس سے پہلے ایک بار مسترد ہو چکا تھا تو منٹو نے اس کا سکرپٹ لکھنے کے لئے احمد ندیم قاسمی کی معاونت بھی لے لی۔ وہ جنوری 1940ء کے ایک خط میں احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں کہ: "اس خط کے ساتھ آپ کو دھرم پتنی کے نام سے ایک فلم اسٹوری بھیج رہا ہوں یہ فلم یہاں کے ایک پروڈیوسر فلمانا چاہتے ہیں۔ مسٹر کیدار شرما سے اس کا مکالمہ لکھوایا گیا جو پسند نہیں کیا گیا سو آپ اس کے مکالمے لکھنا شروع کر دیں اسٹوری آپ ساری کی ساری پڑھ لیں پھر اس کا انگریزی مکالمہ ذہن نشین کرنے کے بعد اس کو نہایت ہی سلیس مگر جذباتی زبان میں ترجمہ کر دیں۔ یہ خیال رہے کہ مکالمہ بہت چست اور جذباتی ہو سلیس زبان سے مراد ایسی زبان نہیں ہے جسے ہم ریڈیائی زبان کہتے ہیں۔ آپ وہی زبان استعمال کریں جس میں آپ ہر روز لکھتے ہیں مگر خیال اس بات کا رہے کہ مکالمے میں کوئی زور ہو اور سننے والے کو مزہ آجائے۔"[ix]

منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے اشتراک سے "دھرم پتنی" فلم کا اسکرپٹ مکمل کیا جس میں کرداروں کی کیفیات کو بھی الگ سے لکھا گیا۔ اس فلم میں منٹو اور احمد ندیم قاسمی دونوں کی محنت اور مشاورت شامل تھی۔ منٹو فلم کا مسودہ مکمل کر کے بمبئی واپس آئے اور احمد ندیم قاسمی پر امید ہو کر پنجاب چلے گئے۔ ادھر شیراز علی حکیم نے اپنی ساری توجہ پونا میں اپنا اسٹوڈیو تعمیر کرنے میں صرف کر دی لیکن فلم دھرم پتنی کو فلمایا نہ جا سکا۔ منٹو نے ان چند برسوں میں دن رات محنت کر کے کئی فلموں کے مسودے تیار کئے لیکن انہیں اس سے کوئی خاص آمدنی حاصل نہ ہو سکی۔ اسے مصور کی ادارت پر ہی

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

انحصار کرنا پڑا۔ منٹو نے چار برسوں تک مصور کی ادارت سنبھالی اور مصور کے لئے خوب محنت کی لیکن وہ فلمی دنیا سے رابطہ بھی استوار رکھے رہے۔ انہوں نے اس نگری کو بہت قریب سے دیکھا لوگوں کو وعدے کر کے مکرتے دیکھا۔ منٹو نے بہت لوگوں کی مدد کی لیکن اس نگری کی طرف سے منٹو کو دھوکا ہی ملا۔ منٹو کو یہاں بمبئی میں اچھے دوست ملے جنہوں نے منٹو کا حوصلہ بھی بڑھایا اور اچھے بُرے وقت میں ساتھ بھی کھڑے رہے۔ دھرم پتنی کے نہ فلمائے جانے کی وجہ سے منٹو کو احمد ندیم قاسمی کی طرف سے شرمندگی ہوئی کیونکہ منٹو نے جب بھی انہیں جس بھی کام کے لئے کہا احمد ندیم قاسمی نے وہ کام کیا۔ اور کام کرنے کے بعد کبھی اس کا مناسب معاوضہ ان تک نہ پہنچ پایا۔ مگر احمد ندیم قاسمی نے کبھی منٹو سے اس کا گلہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس میں منٹو کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اسی برس منٹو نے کئی اور فلمیں بھی لکھیں لیکن ان کو بھی فلمایا نہ جاسکا۔ منٹو نے 1940ء میں کرشن چندر کے ساتھ مل کر فلم ''بنجارہ'' کی کہانی لکھی لیکن جب اس فلم کو فلمایا نہ گیا تو منٹو نے یہ کہانی صرف پانچ سو روپے میں بیچ دی۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم جاری تھی جس کی لپیٹ میں ہندوستان بھی آیا ہوا تھا تو عوام کی توجہ فلموں کی طرف کم تھی۔ منٹو نے 1941ء میں اپنی فلمی دنیا کی سب سے شاہکار کہانی ''مرزا غالب'' لکھی۔ اس وقت منٹو زیادہ وقت ریڈیو کو دے رہے تھے۔ منٹو کو غالب کی شخصیت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس فلم میں مرزا غالب کی زندگی کے اہم حصوں کو عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔ اس فلم میں زیادہ تر غالب کی زندگی کے دکھی لمحوں کو پیش کیا گیا اور ان کی حقیقی روح کو دریافت کیا گیا ہے۔ اس فلم میں بھارت بھوش غالب بنے اور ثریا نے غالب کی بیوی کا کردار ادا کیا۔ اس فلم پر فحاشی کا الزام بھی لگایا گیا لیکن یہ فلم خوب چلی۔ منٹو کی لکھی ہوئی فلم ''نوکر'' 1942ء میں ریلیز ہوئی اس فلم میں نور جہاں ہیروئن تھیں۔ اس فلم کے اسکرپٹ میں بھی بدلاؤ کر دیا گیا جس کا منٹو کو بے حد افسوس ہوا۔ منٹو فلستان سے منسلک ہوئے جہاں انہوں نے فلم ''چل چل رے نوجوان'' لکھی جو ایک ہلکی پھلکی رومانوی فلم تھی جس میں انسان کے مقصد کو دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ طویل عرصہ جاری رہی اور منٹو خود سیٹ پر جا کر ہدایات دیتے تھے۔ منٹو کی لکھی ہوئی فلم بیگم 1945ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں کشمیر کو پس منظر بنایا گیا ہے۔ اس وادی کی خوبصورتی کو عمدگی سے فلم کا حصہ بنایا گیا۔ اسی طرح 1945ء میں ہی فلم ''شکاری'' ریلیز ہوئی اس فلم میں جاپان کے عالمی جنگ میں کردار کو پیش کیا گیا ہے۔

منٹو نے فلستان کے لیے آخری فلم ''آٹھ دن'' لکھی جس میں سینما پر منٹو کا نام چلایا گیا جس سے ان کو ایک خاص احساس ملا۔ منٹو نے بمبئی میں رہتے ہوئے، گھر کی شوبھا گھمنڈ جیسی فلمیں لکھیں جس کو فلمایا نہ جاسکا۔ اسی دوران تقسیم کا عمل شروع ہو گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی منٹو کو بمبئی چھوڑنا پڑا کیونکہ یہاں وہ لوگ بھی ان سے دشمنی کرنے لگے جن پر ان کا بھروسہ تھا۔ منٹو نے بمبئی فلم نگری میں ایک بھرپور زندگی گزاری اور اپنی صحافت کی وجہ سے بھی خاصے معروف ہوئے تقسیم کے بعد منٹو لاہور آ گئے لیکن ان کا دل ہمیشہ بمبئی کی فلم نگری میں ہی الجھا رہا تھا۔

Al-Qirtas القرطاس
Vol. 4 No.1 (2025)
http: https://al-qirtas.com/index.php/Al-Qirtas
E(ISSN): 2709-6076
P(ISSN): 2709-6068

سعادت حسن منٹو کی فلم نگاری کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ منٹو فلم نگری میں جن موضوعات کو قلم بند کر رہے تھے وہ ہندوستانی معاشرے کی کج رویاں تھی۔ جو افسانے کی دنیا میں تو سما سکتی تھی تاہم فلم جس تماش بینی کے معنوں میں آتی ہے اس پر پوری نہیں اترتی تھی۔ دوسری وجہ منٹو کے پاس سرمائے کی کمی تھی جس کی وجہ سے ان کی لکھی گئی ان گنت فلموں میں سے چند کو ہی فلمایہ گیا اور زیادہ تر سرمائے کی قلت کی وجہ سے زیادہ متاثر کن نہ بن سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں فلمی دنیا میں ایک کے بعد ایک ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس ناکامی سے منٹو کی فلم نگاری میں طبع آزمائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقیناً ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح فلم نگار بھی تھے جنہوں نے اپنی فلموں میں ہمیشہ معاشرتی اصلاح کے پہلوؤں کو مد نظر رکھا۔

حوالہ جات:

i۔ پرویز انجم، امرتسر کا منٹو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۷۔

ii۔ ایضاً، ص ۵۷۔

iii۔ امجد ایوب، مرزا، ڈاکٹر، پاکستانی سینما میں ثقافت کی پہلی نمائش (لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۔

iv۔ ایضاً، ص ۱۷۔

v۔ طاہر عباس، ڈاکٹر، منٹو فلمیں (مباحث)، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۶۔

vi۔ پرویز انجم، منٹو اور سینما (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۹۳۔

vii۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب)، منٹو کے خطوط (راولپنڈی: کتاب نما، ۱۹۶۲ء)، ص ۵۷۔

viii۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔

ix۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔